از مفتی دارالعلوم دیوبند مولانا مفتی حبیب الرحمٰن خیرآبادی

عورت کی حکمرانی کی شرعی حیثیت

دارالعلوم دیوبند کے ترجمان ماہنامہ "دارالعلوم" نے نومبر ۸۹ء کے شمارہ میں "عورت کی سربراہی اسلام کی نظر میں" کے عنوان سے مفتی دارالعلوم دیوبند کا یہ مقالہ شائع کیا ہے۔ مقالہ کی اہمیت کے پیش نظر ماہنامہ "دارالعلوم" کے شکریہ کے ساتھ اسے نقل کیا جارہا ہے۔ اسی عنوان پر مدیر "الشریعة" کا مقالہ آئندہ شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ (ادارہ)

عورت کی سربراہی کا مسئلہ پاکستان میں آج کل موضوع سخن بنا ہوا ہے۔ ہندوستان میں بھی کچھ لوگ دلچسپی لے رہے ہیں اور اس بارے میں اخبارات میں بعض مفصل تحریریں نظر سے گذریں۔ علاوہ ازیں ایک فتویٰ بھی دیکھنے میں آیا جس میں اسلامی مملکت کے اندر عورت کی سربراہی کو قرآن وحدیث سے اور فقہی روایات سے مطلقاً جائز قرار دیا گیا ہے اور اس فتوے کو دارالعلوم دیوبند کی طرف منسوب کرکے مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند کے نام سے شائع کیا گیا ہے حالانکہ دارالعلوم دیوبند سے جواز کا کوئی فتویٰ نہیں دیا گیا اور نہ اس فتویٰ نویس کا دارالعلوم سے کوئی تعلق ہے۔ اس فتویٰ اور اس کے غلط انتساب کی وجہ سے پاکستان میں خصوصاً اور ہندوستان میں عموماً بڑا خلجان واضطراب پایا جارہا ہے اس لیے بعض بزرگوں کی درخواست پر اسکا تفصیلی جواب تحریر کیا جارہا ہے۔

جنسی اعتبار سے عورت کی حیثیت

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں عورتوں کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاهلیة (احزاب)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضهم علی بعض (نساء)

اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو اپنے گھروں میں رہنے کا حکم دیا ہے اور بلا ضرورت شرعی باہر نکلنے سے انہیں منع فرمایا ہے۔ انہیں باہر کی جدوجہد سے یکسو ہوکر اپنے گھروں کی اصلاح وتربیت کا فریضہ انجام دینا چاہیے نیز بہت سے اسباب ووجوہ کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر حکمرانی اور بالادستی عطا فرمائی ہے۔

عورت ذات کو اللہ تعالیٰ نے ناقص العقل اور ناقص الدین بنایا، انہیں امامت صغریٰ، امامت کبریٰ، اذان خطبہ، اقامت جمعہ، اقامت عیدین سے محروم رکھا۔ حدود وقصاص میں ان کی شہادت غیر معتبر قرار دی گئی، مردوں کے

مقابلہ میں تنہا عورت کی گواہی آدھی قرار دی گئی۔ انہیں جنازہ میں جانے اور بغیر محرم کے سفر کرنے سے منع کیا گیا۔ جہاد جیسا اہم ترین رکن ان کے ذمہ واجب نہیں کیا گیا۔ وہ مردوں کی امامت نہیں کر سکتی ہیں۔

علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے عقل، علم، فہم، تدبر، حسن تدبیر، قوت نظریہ، قوت عملیہ، قوت جسمانیہ، شجاعت، قوت، محنت، صبر و تحمل کے لحاظ سے مردوں کو عورتوں پر فضیلت دی ہے پھر مرد لوگ عورتوں پر بڑا مال خرچ کرتے ہیں، ان کا مہر دیتے ہیں، انہیں رہنے کے لیے مکان نان نفقہ دیتے ہیں اس لحاظ سے وہ عورتوں کے محسن ہیں اور محسن ہی کو اپنے محسَن پر حکمرانی کا حق ہوتا ہے، محسَن اپنے محسن پر حکمرانی کا حق نہیں رکھتا ہے۔

عورت کی حکمرانی و سربراہی

ان ہی اسباب و وجوہ کی بنا پر کسی اسلامی مملکت میں عورت کی حکمرانی و سربراہی موجب عدم فلاح اور علماء محدثین و فقہاء کرام کے نزدیک بالاتفاق ناجائز ہے۔ عورت کو حکمران بنانے والے سب ہی گنہگار ہوں گے جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے،

لن یفلح قوم ولوا امرهم امرأة

بعض روایات میں یہ الفاظ ہیں،

لن یفلح قوم اسندوا امرهم الی امرأة

اور بعض روایات میں ہے،

لن یفلح قوم تملکهم امرأة

اور ایک روایت میں ہے،

مخرج قوم لا یفلحون قائدهم امرأة فی الجنة (اعلاء السنن ج ۱۵ ص ۳)

ان سب احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ عورت کو اپنا حکمران بنائیں گے اور اپنے ملک کی سربراہی کسی عورت ذات کے سپرد کر دیں گے وہ لوگ فلاح سے محروم رہیں گے۔ اسلامی تاریخ کے ہر دور میں امت مسلمہ کا اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ حکومت کی سربراہی کسی عورت کو نہیں سونپی جا سکتی اس کے لیے جہاں اور شرائط ذکر کیے گئے ہیں ان میں ایک مذکر ہونا بھی شرط قرار دیا گیا۔ چنانچہ قاضی ابو بکر ابن العربی محدث بخاری کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: وهذا نص فی ان المرأة لا تکون خلیفة ولا خلاف فیه (ج ۳ ص ۱۴۴۵)

یہ حدیث اس بات پر نص ہے کہ عورت خلیفہ نہیں ہو سکتی اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ (احکام القرآن ج ۳ ص ۱۴۴۵)

ابن العربی کا یہ اقتباس علامہ قرطبی نے بھی اپنی تفسیر میں نقل فرمایا ہے اور اس کی تاکید فرمائی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ علماء کے درمیان اس میں اختلاف نہیں ہے۔

قال القاضی ابوبکر بن العربی هذا نص من ان المرأة لا تکون خلیفة ولا خلاف فیه

(تفسیر القرآن للقرطبی ج ۱۳ ص ۱۸۳)

علامہ بغوی جو مشہور مفسر و محدث گزرے ہیں وہ لکھتے ہیں:

اتفقوا علی ان المرأة لا تصلح ان تکون اماما لان الامام یحتاج الی الخروج لاقامة امر الجهاد والقیام بامر المسلمین ..... والمرأة عورة لا تصلح للبروز (شرح السنة للبغوی ج ۱۰ ص ۷۷)

باب کراهیة تولیة النساء)

امت کا اس پر اتفاق ہے کہ عورت حکومت کی سربراہ نہیں بن سکتی کیونکہ امام کو جہاد کے معاملات انجام دینے اور مسلمانوں کے معاملات نمٹانے کے لیے باہر نکلنے کی ضرورت پڑتی ہے اور عورت پوشیدہ (پردہ میں) رہنی چاہیے۔ مجمع عام میں اس کا جانا جائز نہیں۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

"حکمرانی کی چوتھی شرط مذکر ہونا ہے لہٰذا کسی عورت کی امامت منعقد نہیں ہوگی اگرچہ وہ تمام اوصاف کمال سے متصف ہو اور اس میں استقلال کی صفات پائی جاتی ہوں۔"

علامہ ماوردیؒ جو اسلامی سیاست کے ماہرین میں شمار

کیے جاتے ہیں اور ان کی مشہور کتاب "الاحکام السلطانیہ" اسلامی سیاست کا اہم ترین ماخذ سمجھی جاتی ہے اس میں انہوں نے عورت کی سربراہی تو کجا عورت کو وزارت کی ذمہ داری سونپنا بھی ناجائز قرار دیا ہے۔ انہوں نے وزارت تفویض اور وزارت تنفیذ ہر طرح کی ذمہ داری عورت پر ڈالنا ناجائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

فصل واما وزارة التنفيذ فحكمها اضعف وشروطها اقل (الی) ولا يجوز ان تقوم بذلك امراة وان كان خبرها مقبولا لما تضمنه معنى الولايات المصروفة عن النساء لقول النبي صلى الله عليه وسلم "ما افلح قوم اسندوا امرهم الى امراة" ولان فيها من طلب الرأي وثبات العزم ما تضعف عن النساء ومن الظهور عن مباشرة الامور ما هو عليهن محظور

(صـ۲۰، صـ۲۴)

جہاں تک وزارتِ تنفیذ کا تعلق ہے وہ نسبتاً کمزور ہے اور اس کے شرائط بھی کم ہیں لیکن یہ جائز نہیں کہ کوئی عورت اس کی ذمہ دار بنے اگرچہ عورت کی خبر مقبول ہے کیونکہ یہ وزارت ایسی ولایتوں پر مشتمل ہے جن کو شریعت نے عورتوں سے الگ رکھا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "لن یفلح قوم ولوا امرھم امراۃ"۔ یعنی جو قوم اپنے معاملات کسی عورت کے سپرد کرے وہ فلاح نہ پائے گی۔ علاوہ ازیں اس وزارت کے لیے جو اصابت اور اولوالعزمی درکار ہے وہ صنفِ نازک میں بہت ضعیف درجہ کی ہوتی ہے۔ نیز اس وزارت کے فرائض انجام دینے کے لیے ایسے انداز سے لوگوں کے سامنے ظاہر ہونا پڑتا ہے جو عورتوں کے لیے شرعاً ممنوع ہے۔

بہرحال عورت کے لیے کسی مملکت کی سربراہی کے عدم جواز کا مسئلہ متفق علیہ اور اجماعی مسئلہ ہے۔ علامہ ابن حزمؒ نے اجماعی مسائل پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

واتفقوا ان الائمة لا تجوز لامراة

تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ حکومت کی سربراہی کسی عورت کے لیے جائز نہیں۔

(مراتب الاجماع لابن تیمیہ صـ۱۲۶)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے علامہ ابن حزم کی مذکورہ کتاب پر تنقید لکھی ہے یعنی جن مسائل کو علامہ ابن حزمؒ نے اجماعی قرار دیا ہے ان میں سے بعض بعض مسائل میں ابن تیمیہؒ نے اختلاف کیا ہے لیکن عورت کی سربراہی کے مسئلہ میں انہوں نے علامہ ابن حزم پر کوئی اعتراض نہیں کیا ہے۔

(نقد مراتب الاجماع لابن تیمیہ صـ۱۲۶)

امام ابوحنیفہ وابن جریر طبریؒ کا موقف

کتب احناف مثلاً درمختار، فتح القدیر وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جن امور میں عورتوں کی شہادت جائز ہے ان امور میں عورت کو قاضی بنانا بھی جائز ہے کیونکہ عورت شہادت کی اہل ہے اور جب شہادت کی اہلیت رکھتی ہے تو اس کو قضا کا عہدہ بھی دیا جاسکتا ہے۔ یعنی اگر کسی جگہ لوگوں نے عورت کو قاضی بنا دیا یا وہ خود اپنی طاقت کے زور سے قاضی بن بیٹھی اور کسی معاملہ میں حدود شرع کی رعایت کرتے ہوئے فیصلہ کیا تو وہ فیصلہ قابل تسلیم ہوگا، البتہ اس کا فیصلہ حدود و قصاص میں معتبر نہ ہوگا مگر اس کے بعد متصلاً یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ عورت کو قاضی بنانا مکروہ ہے یعنی یہ فعل بہرحال گناہ کا ہے۔ درمختار میں ہے:

والمرأة تقضى فى غير حد وقود وان اثم المولى لها لخبر البخاري لن يفلح قوم الخ

یعنی عورت کو قاضی بنانا فعل حرام کے قریب قریب ہے اور ممنوع ہے۔

اسی طرح مشہور مفسر حافظ ابن جریر طبری کی طرف یہ بات منسوب کی جاتی ہے کہ وہ عورت کے قاضی بنانے کے جواز کے قائل ہیں اور جب عورت کو قاضی بنایا جاسکتا ہے تو اسے کسی مملکت کی سربراہی بھی سونپی جاسکتی ہے۔ ان

کی تصانیف میں تتبع و تلاش کے باوجود ہمیں ان کی یہ رائے نہیں مل سکی۔ جب تک ان کی کسی کتاب کا اقتباس ہمارے سامنے نہ ہو ان کے موقف کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ بالفرض ہم تسلیم بھی کرلیں کہ وہ امام ابوحنیفہؒ کی طرح عورت کو قاضی بنانے کے جواز کے قائل ہیں تو اس بات کو مطلقاً عورت کی سربراہی کے جواز کے عنوان سے نقل کرنا بھی درست نہ ہوگا۔

عورت کو قصاص، حدود، تعزیرات اور نکاح کے معاملات کے سوا دوسرے امور میں قاضی بنائے جانے کا مطلب یہ ہے کہ کسی مسئلہ میں اگر عورت کو ثالث بنایا جائے یا جزوی طور پر کوئی مقدمہ اس کے سپرد کیا جائے اور وہ شریعت کے اصول و ضابطے کے مطابق صحیح فیصلہ کرے تو وہ فیصلہ صحیح اور معتبر ہوگا۔ چنانچہ ہمارے اس خیال کی تائید قاضی ابوبکر ابن العربیؒ کی تحریر سے ہوتی ہے۔ وہ بخاری شریف کی حدیث لن یفلح قوم الخ نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"یہ حدیث اس بات پر نص ہے کہ عورت خلیفہ نہیں ہوسکتی اور اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں، البتہ امام محمد بن جریر طبری سے منقول ہے کہ ان کے نزدیک عورت کا قاضی ہونا جائز ہے لیکن ان کی طرف اس مسلک کی نسبت صحیح نہیں ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مذہب ایسا ہی ہوگا جیسا کہ امام ابوحنیفہؒ سے منقول ہے کہ عورت ان معاملات میں فیصلہ کرسکتی ہے جس میں وہ شہادت دینے کی اہلیت رکھتی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عورت علی الاطلاق قاضی بن جائے اور یہ کہا جائے کہ فلاں عورت کو قصاص اور نکاح کے معاملات کے علاوہ قاضی بنایا جارہا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو کسی مسئلہ میں ثالث بنالیا جائے یا کوئی ایک مقدمہ جزوی طور پر اس کے سپرد کردیا جائے وانما ذلک کسبیل التحکیم او الاستنابۃ فی القضیۃ الواحدۃ (احکام القرآن لابن العربی ص ۱۴۴۵ ج ۳)

بہرحال ان دونوں بزرگوں سے عورت کے لیے مقدمات کا فیصلہ کرنے کا جو جواز منقول ہے وہ باقاعدہ قاضی بنانے سے متعلق نہیں بلکہ جزوی حیثیت سے ثالث کے طور پر کوئی انفرادی قضیہ نمٹانے سے متعلق ہے۔ پس فقہاء کا تھوڑا سا اختلاف عورت کے قاضی بننے نہ بننے کے بارے میں ضرور ہے لیکن حکومت کا سربراہ بننے کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ چنانچہ امام الحرمین علامہ جوینیؒ فرماتے ہیں:

"سربراہی کے لیے مذکر ہونے کی شرط میں کوئی شک نہیں ہے، جن علماء نے ایسے امور میں عورت کے قاضی بننے کو جائز کہا ہے جن میں عورت گواہ بن سکتی ہے وہ بھی سربراہی کے لیے عورت کی تقرری ناممکن قرار دیتے ہیں کیونکہ قضا کے بارے میں گو یہ ممکن ہے کہ اس کے حدود و اختیارات کو معاملات کے ساتھ خاص کردیا جائے مگر حکومت کی سربراہی کو شریعت کے نظام کے مطابق کچھ محدود معاملات کے ساتھ خاص کرنا ممکن نہیں۔"

حضرت تھانویؒ کے فتوے کی حیثیت

عورت کی سربراہی کے جواز میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کا ایک فتویٰ پیش کیا جاتا ہے جو امداد الفتاویٰ میں مذکور ہے۔ حضرت نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ جمہوری حکومت میں سربراہ ایک رکن مشورہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے اختیار کلی سلطان وقت کی طرح نہیں ہوتا ہے۔ ہم ذیل میں بعینہ وہ فتوے بمع سوال کے درج کرتے ہیں:

سوال ۱۰۳: بخاری میں حدیث ہے لن یفلح قوم ولوا امرھم امرأۃ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا والی و حاکم ہونا موجب عدم فلاح ہے۔ تو کیا جن ریاستوں پر عورتیں حکمران ہیں وہ بھی اس میں داخل ہیں؟

الجواب: حکومت کی تین قسمیں ہیں، ایک قسم وہ جو تام بھی ہو عام بھی ہو۔ تام سے مراد یہ کہ حاکم بالفرادہ خودمختار

ہو یعنی اس کی حکومت شخصی ہو اور اس کے حکم میں کسی حاکم اعلیٰ کی منظوری کی ضرورت نہ ہو گو اس کا حاکم ہونا اس پر موقوف ہو، اور عام یہ کہ اس کی محکوم کوئی محدود و قلیل جماعت نہ ہو۔

دوسری قسم وہ جو تام تو ہو مگر عام نہ ہو

تیسری قسم وہ جو عام ہو مگر تام نہ ہو

مثال اول کی کسی عورت کی سلطنت یا ریاست بطرز مذکور شخصی ہو۔

مثال ثانی کی کوئی عورت کسی مختصر جماعت کی منتظم بلا شرکت ہو۔

مثال ثالث کی کسی عورت کی سلطنت جمہوری ہو کہ اس میں والی صوری درحقیقت والی نہیں بلکہ ایک رکن مشورہ ہے اور والی حقیقی مجموعہ مشیروں کا ہے۔ حدیث کے الفاظ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد حدیث میں پہلی قسم ہے۔ چنانچہ سبب ورود اس حدیث کا کہ اہل فارس نے دختر کسریٰ کو بادشاہ بنایا تھا اور لفظ "ولوا" میں تولیت کے اطلاق سے متبادر اس کا کمال مفہوم ہونا پھر اس کی اسناد قوم کی طرف ہونا سب اس کا قرینہ ہے کیونکہ یہ طریقہ تولیت کاملہ کا سلطان ہی بنانے کے ساتھ خاص ہے کہ قوم کے اہل حل و عقد باہم متفق ہو کر کسی کو سلطان بنا دیتے ہیں اور سلطان کا کسی کو حکومت دینا یہ بھی بواسطہ سلطان کے قوم ہی کی طرف مسند ہوگا۔ بخلاف قسم ثانی کے کہ وہاں گو تولیت کاملہ ہوتی ہے مگر وہ مستفاد قوم سے حقیقتاً یا حکماً نہیں ہوتی اور بخلاف ثالث کے کہ وہاں گو اسناد اس کی قوم کی طرف صحیح ہے مگر تولیت کاملہ نہیں ہے بلکہ وہ مشورہ محضہ ہے گو اس مشورہ کو دوسرے منفرد مشوروں پر ترجیح ہو لیکن اس میں ولایت کاملہ کی شان نہیں ہے ورنہ تمام ارکان کے مخالف ہونے کی صورت میں بھی اسی کو سب پر ترجیح ہوتی، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ یہ قرینہ تو خود الفاظ حدیث سے ماخوذ ہے۔ اب دوسرے دلائل شرعیہ میں جو نظر کی جاتی ہے تو اس تفصیل کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت بلقیس کی سلطنت کا قصہ قرآن مجید میں مذکور ہے۔ اس میں آیت ہے:

ما کنت قاطعة امرا حتی تشهدون جس میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلطنت کا طرز عمل خواہ ضابطہ سے خواہ بلقیس کی عادت مستمرہ سے سلطنت جمہوری کا سا تھا اور بعد ان کے ایمان لے آنے کے کسی دلیل سے ثابت نہیں کہ ان سے انتزاع سلطنت کیا گیا ہو۔ پس ظاہر حکایت سلطنت اور عدم حکایت انتزاع سے اس سلطنت کا بحالہا باقی رہنا ہے اور تاریخ صراحۃً اس کی مؤید ہے اور قاعدہ اصولیہ ہے کہ اذا قص اللہ و رسولہ علینا امراً من غیر نکیر علیہ فہو حجة لنا۔ پس قرآن سے ظاہراً ثابت ہو گیا کہ سلطنت جمہوری عورت کی ہو سکتی ہے جو قسم ثالث ہے حکومت کے اقسام ثلثہ مذکورہ میں سے اور راز اس میں یہ ہے کہ حقیقت اس حکومت کی محض مشورہ ہے اور عورت اہل ہے مشورہ کی۔ چنانچہ واقعہ حدیبیہ میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلمہؓ کے مشورہ پر عمل فرمایا اور انجام اس کا محمود ہوا اور اگر سلطنت شخصی بھی ہو مگر ملکہ التزاماً اپنی انفرادی رائے سے کام نہ کرتی ہو وہ بھی اس حدیث میں داخل نہیں کیونکہ علت عدم فلاح کی نقصان علم ہے اور جب مشورہ رجال سے اس کا انجبار ہو گیا تو علت مرتفع ہو گئی تو معلول یعنی عدم فلاح بھی منتفی ہو گیا جیسے نقصان شہادت نساء انضمام شہادت رجال سے منجبر ہو جاتا ہے سلطنت بلقیس میں یہ شق بھی محتمل ہے جس کی طرف ادھر اس عبارت میں اشارہ بھی کیا گیا ہے کہ خواہ بلقیس کی عادت مستمرہ الخ اور حدیث شیخین میں ہے فالامام الذی علی الناس راع الی قوله علیه السلام والمرأة راعیة علی بیت زوجها وولده وهی مسئولة عنهم لفظ راعیة مثل لفظ راع جو اس سے قبل ہے مستعمل ہے معنی حاکم میں اس حدیث سے قسم ثانی کا عورت کے لیے مشروع ہونا ثابت ہوتا ہے۔ حضرات فقہاء نے امامت کبریٰ میں ذکورۃ کی شرط صحت اور قضا میں گو شرط صحت نہیں مگر شرط صون عن الاثم فرمایا ہے اور نظارت و وصیت و شہادت میں کسی درجہ میں اس کو شرط نہیں کہا، کذا فی الدر المختار باب الامامة وکتاب القاضی

الی القاضی، قضاء کے اس علم مذکور قسم اوّل وثانی کے احکام کی تفریع ہے اور قسم ثالث متقیس ہے قسم ثانی پر لاشتراکھما فی کونھما غیر جامعین لوصف التمام والعموم جب دلائل بالا سے ثابت ہوگیا کہ حدیث میں مذکور قسم اوّل ہے تو معلوم ہوگیا کہ ایسی ریاستیں جو آج کل زیرِ فرمان عورتوں کے ہیں اس حدیث میں داخل نہیں اس لیے کہ اگر اس کے محکومین کو مختقر قرار دیا جائے تب وہ قسم ثانی ہے اور اگر اس جماعت کو مختقر نہ قرار دیا جائے تب بھی وہ درحقیقت جمہوری ہیں یا تو ظاہراً بھی جہاں پارلیمنٹ کا وجود شاہد ہے اور یا صرف باطناً جہاں پارلیمنٹ تو نہیں ہے لیکن اکثر احکام میں کسی حاکم بالا سے جو صاحبِ سلطنت یا نائب سلطنت ہو منظوری لینا پڑتی ہے پس اس طور سے وہ قسم ثالث ہیں اور اب یہ بھی شبہ نہ رہا کہ ظاہر یہ رئیسات مثل قاضی کے ہیں اور قاضی عورت کا حکم حدود و قصاص میں نافذ نہیں ہوتا۔ کما صرح بہ الفقہاء۔

تو ایسے احکام کے نفاذ کی ان ریاسات میں کوئی صورت صحت کی نہ ہوگی۔ وجہ رفع شبہ کی ظاہر ہے کہ وہ ریاست اوّلاً تو جمہوری ہے اور علی السبیل التنزل یوں کہا جائے گا کہ چونکہ قضاۃ تو ذکور ہیں اس لیے وہ احکام نافذ ہو جائیں گے جیسا کہ فقہاء نے قضاۃ منصوبین من السلطان غیر المسلم کے جمیع احکام کو صحیح و نافذ فرمایا ہے بالجملہ تحقیق مذکور ثابت ہوگیا کہ یہ ریاستیں عدم فلاح کے حکم سے بری ہیں۔ واللہ اعلم۔

اس فتوے کا حاصل یہ ہے کہ ایسی شخصی حکومت جس میں اقتدارِ اعلیٰ صرف امیر المسلمین یا بادشاہِ وقت کو ہوتا ہے اور اسے کلی اختیارات حاصل ہوتے ہیں ایسی حکومت کی سربراہ عورت کو بنانا عدم فلاح کا موجب ہے اور جمہوری حکومت جس میں پارلیمنٹ کے مشوروں کے بعد احکام کا نفاذ ہوتا ہے سربراہ کی حیثیت اس حکومت میں ایک رکن مشورہ کی ہوتی ہے اس لیے وہ والی حقیقی نہیں ہوتا۔ والی حقیقی تو پارلیمنٹ کے ممبروں کا مجموعہ ہوتا ہے اور رکن مشورہ بننا عورت کے لیے جائز ہے کیونکہ جمہوری حکومت کی حقیقت محض شوریٰ ہے اور عورت مشورہ کی اہل ہے البتہ امامت کبریٰ یعنی حکومت کی سربراہی میں مرد ہونا شرط ہے اور قاضی بنانے میں صون من الاثم یعنی گناہ سے بچنا شرط ہے۔ مرد ہونا شرط نہیں ہے۔

کچھ لوگ حضرت تھانویؒ کے اس فتوے کو عورت کی سربراہی کے جواز میں پیش کرتے ہیں اور جمہوری حکومت کے سربراہ کو پارلیمانی مشیروں کا تابع سمجھتے ہیں حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ موجودہ جمہوری نظام حکومت کی سربراہی کو حضرت تھانویؒ کے مذکورہ فتوے پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ حضرت تھانویؒ کا فتویٰ انگریزی دور میں لکھا گیا ہے اور انگریزی دور کی رئیسات کے بارے میں لکھا گیا تھا، آج کی آزاد جمہوری حکومتوں کی صورتِ حال انگریزی دور سے بہت مختلف فیہ ہے۔ جمہوری نظام حکومت میں خواہ پارلیمنٹری نظام ہو یا صدارتی طاقت کا مرکز وزیر اعظم اور صدر مملکت دونوں ہی ہوتے ہیں۔ کہیں صدر کا پلہ بھاری ہوتا ہے اور کہیں وزیر اعظم کا۔ اس لیے جمہوری حکومتوں کے یہ دونوں عہدے حضرت تھانویؒ کے فتوے کی رُو سے قسم اوّل (یعنی حکومت تام بھی اور عام بھی) میں داخل ہیں۔ لہٰذا حضرت تھانویؒ کا فتویٰ مجوزین کے لیے مفید مقصد نہیں ہو سکتا۔ غرض تاریخ اسلام میں کبھی کسی فقیہہ یا عالم نے عورت کی حکمرانی کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا ہے۔

عورت کی سربراہی پر استدلال بلقیس کے واقعہ سے

کچھ لوگ عورت کی سربراہی پر جواز کے لیے ملکہ سبا یعنی بلقیس کی حکمرانی کا واقعہ پیش کرتے ہیں یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام کے خط لکھنے پر جب وہ مطیع اور فرمانبردار ہوگئی اور اسلام قبول کر لیا تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی بادشاہت کو برقرار رکھا جیسا کہ بعض کتابوں میں اس کا ذکر ملتا ہے حالانکہ قرآن پاک کے الفاظ پر نظر ڈالنے سے معاملہ برعکس معلوم ہوتا ہے حضرت سلیمان

علیہ السلام نے بلقیس کی حکومت تسلیم نہیں کی بلکہ اس کے نام جو خط لکھا اس کے الفاظ یہ ہیں:

انہ من سلیمان وانہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ان لا تعلوا علی واتونی مسلمین

یعنی تم میرے مقابلہ میں سر نہ اٹھاؤ اور میرے پاس میری مطیع اور فرمانبردار بن کر آجاؤ۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی حکومت کو نہ صرف یہ کہ تسلیم نہیں فرمایا بلکہ اسے اپنا ماتحت بن کر آنے کا حکم دیا نیز اس کا بھیجا ہوا تحفہ قبول نہیں فرمایا۔ اس کا تخت بھی اٹھوا کر منگوا لیا اور اس کی ہئیت بھی بدل ڈالی اور بلقیس جب حضرت سلیمانؑ کے محل میں آئی تو اس نے کہا:

پروردگارا! میں نے اپنی جان پر ظلم کیا اور میں سلیمان کے ساتھ اللہ رب العالمین کے آگے جھک گئی۔ (سورہ نمل ۴۴)

قرآن پاک کے بیان سے دُور تک بھی بلقیس کی سربراہی اور اس کی حکومت برقرار رکھنے کا شائبہ تک نظر نہیں آتا، بلکہ قرآن کے پڑھنے سے یہی تاثر پیدا ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کے اسلام کے بعد اس کی حکومت کو جائز نہیں رکھا نہ اسے تسلیم فرمایا بلکہ اس کی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔

بعض اسرائیلی روایات میں منقول ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس سے نکاح کر کے اسے یمن بھیج دیا تھا اور بعض روایات میں ہے کہ نکاح کرنے کے بعد شام بھیج دیا تھا، بعض میں ہے کہ نکاح کے بعد بلقیس کو اپنے پاس رکھا، بعض میں ہے کہ بلقیس کا نکاح ہمدان کے بادشاہ سے کر دیا۔ غرض اس سلسلہ میں تاریخی روایات بہت متضاد ملتی ہیں۔ علامہ قرطبیؒ نے ان تمام اسرائیلی روایات کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں ہے نہ اس بارے میں کہ حضرت سلیمان نے بلقیس سے نکاح کیا نہ اس بارے میں کہ کسی اور سے نکاح کرایا۔ (تفسیر قرطبی ص ۲۱۰-۲۱۱ ج ۱۳)

بہر حال بلقیس کی سربراہی اور حکومت کا پتہ جن روایات سے معلوم ہوتا ہے وہ تمام کی تمام غیر صحیح اور غیر مستند ہیں اور آپس میں متضاد ہیں۔ اس طرح کی روایات سے عورت کی سربراہی پر استدلال کسی طرح درست نہ ہوگا۔ حضرت تھانویؒ نے تفسیر بیان القرآن میں لکھا ہے:

"ہماری شریعت میں عورت کو بادشاہ بنانے کی ممانعت ہے پس بلقیس کے قصہ سے کوئی شبہ نہ کرے۔ اوّل تو یہ فعل مشرکین کا تھا دوسرے اگر شریعت سلیمانیہ نے اس کی تقریر بھی کی ہو تو شرع محمدی میں اس کے خلاف ہوتے ہوئے وہ حجت نہیں۔ (بیان القرآن ص ۵۶ ج ۸ سورہ نمل)

جنگ جمل میں حضرت عائشہؓ کی شرکت سے استدلال

بعض حضرات نے عورت کی سربراہی پر جنگ جمل کے واقعہ سے استدلال کیا ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اس جنگ میں قیادت کی تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ تو حضرت عائشہؓ نے کبھی قیادت کا دعویٰ کیا نہ ان کے ساتھیوں نے آپ کو جنگ میں قائد و سربراہ بنایا نہ ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ حضرت عائشہؓ کا مقصد نہ کوئی سیاست و حکومت تھی نہ ہی وہ جنگ کرنے کے ارادہ سے نکلی تھیں بلکہ روایات سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ محض حضرت عثمانؓ کے قصاص کے جائز مطالبے کی تقویت اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کے درمیان مصالحت کرانے کے مقصد سے گئی تھیں۔ چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

جب حضرت عائشہؓ بصرہ جا رہی تھیں تو راستہ میں ایک جگہ قیام کیا، رات میں وہاں کتے بھونکنے لگے۔ حضرت عائشہؓ نے لوگوں سے پوچھا یہ کون سا

مقام ہے، لوگوں نے بتایا "حوأب" "تالاب چشمہ ہے" حوأب کا نام سنتے ہی حضرت عائشہؓ چونک اٹھیں۔ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ہم ازواج مطہرات سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ تم میں سے ایک کا اس وقت کیا حال ہوگا جب اس پر حوأب کے کتے بھونکیں گے۔

(مسند احمد ص۵۲ ج۱)

حضرت عائشہؓ نے حوأب کا نام سن کر آگے جانے سے انکار کر دیا اور اپنے ساتھیوں سے اصرار کیا کہ مجھے مدینہ واپس لوٹا دو۔ لیکن بعض حضرات نے آپ کو چلنے کے لیے اصرار کیا اور کہا کہ آپ کی وجہ سے مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح ہو جائے گی۔ بہرحال حضرت عائشہؓ نے دوبارہ سفر شروع کیا اور بصرہ پہنچیں اور جو مقدر میں تھا وہ پیش آیا۔ (البدایہ والنہایہ ص۲۳۱ ج۶)

باوجودیکہ حضرت عائشہؓ کا سفر مسلمانوں کے درمیان مصالحت کے خالص دینی مقصد کے لیے تھا مگر صحابہ کرام اور دوسری امہات المومنین کو حضرت عائشہؓ کا خواتین کے اسلامی دائرے سے نکلنا پسند نہ آیا۔ چنانچہ حضرت ام سلمہؓ نے جب حضرت عائشہؓ کو خط لکھا اور اس میں انہیں گھر سے نکلنے پر تنبیہ فرمائی اور گھر بیٹھے کی نصیحت فرمائی۔ اسی طرح کا نصیحت آمیز خط حضرت زید بن صوحانؓ نے بھی لکھا۔ چنانچہ اس سفر کرنے پر حضرت عائشہؓ کو بعد میں بڑی ندامت و شرمندگی رہی۔ حافظ ابن عبدالبرؒ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے فرمایا آپ نے مجھے اس میں جانے سے کیوں نہیں روکا؟ اگر آپ مجھے روک دیتے تو میں گھر سے باہر نہیں نکلتی۔ بہرحال وہ نادم ہوئیں اور اپنے اس نکلنے پر توبہ بھی کی۔ بعد میں ان کا یہ حال ہو گیا تھا کہ قرآن پاک کی تلاوت کے وقت جب آیت وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ پر پہنچتیں تو اس قدر روتیں کہ ان کی اوڑھنی آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔ ان حالات میں حضرت عائشہؓ کی سربراہی کے اوپر استدلال کرنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ اس کا تو تصور بھی ان کے حاشیۂ خیال میں نہیں آیا تھا۔

بہرحال کسی اسلامی ملک کی سربراہی کے لیے عورت کا تقرر کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ تمام ائمہ کا یہ متفقہ فیصلہ ہے اور یہ اجماعی مسئلہ بن چکا ہے۔ کامل العقل اور اہلیت رکھنے والے مردوں کے موجود ہوتے ہوئے عورت کو ملک کی وزارت یا صدر کے لیے منتخب کرنا اسلام اور مسلمانوں کے لیے نہ صرف ننگ و عار کا باعث ہے بلکہ تاریخ اسلام میں ایک بدنما داغ ہے اور مملکت کے یقینی ناکام ہونے کی علامت ہے۔ حدیث شریف میں ہے اخروھن من حیث اخرھن اللہ۔ یعنی عورتوں کو پیچھے کر دو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے رتبہ کو مردوں کے مقابلے میں (سلطنت و ولایت وغیرہ میں) پیچھے رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق کی اتباع کرنے کی توفیق بخشے اور اپنے حفظ و امان میں رکھے آمین۔

جب عورت حکمران ہو

تو زمین کا پیٹ تمہارے لیے
اس کی پشت سے بہتر ہے

(ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وسلم)

جب تمہارے حکام تم میں سے اچھے لوگ ہوں تمہارے مالدار سخی ہوں اور تمہارے معاملات باہمی مشورے سے طے پائیں تو تمہارے لیے زمین کی پشت زمین کے پیٹ سے بہتر ہے اور جب تمہارے حکام برے لوگ ہوں، تمہارے مالدار بخیل ہوں اور تمہارے معاملات عورتوں کے سپرد ہوں تو
زمین کا پیٹ تمہارے لیے
اس کی پشت سے بہتر ہے

(ترمذی ص۵۱ ج۲)